Lesson 1: Yusuf (Ayaat 1- 18): Day 2 سُوْرَۃُ یُوسُف کی تفسیر

آپ سب بہت خوش قسمت ہیں کہ اللہ سُبحانہ و تعالیٰ نے آپ کو قرآنِ پاک کی وہ سورۃ پڑھنے کا موقع دیا جو انسان کو جینا سکھاتی ہے، دُشمن کو دوست کیسے بنایا جاتا ہے، محسن کیسے بنتے ہیں، سکھاتی ہے۔ رشتوں کی چپقلش کیا ہوتی ہے، سُسرال جانے والی بیٹی کو کیا تحفہ دیا جائے۔ دُلھن کے لیے سورۃ یوسف کی کیا اہمیت ہے۔ انسان کسطرح صبر جمیل کر پاتا ہے۔ مرد اور عورتیں خود کو باہر کے گندے ماحول سے کیسے بچا سکتے ہیں۔ ان سب سوالوں کو جواب ہمیں سورۃ یوسف میں ملے گا۔

ترتیب کے اعتبار سے سورۃ یوسف گیارہویں نمبر کی صورت ہے۔ یہ صورت اپنے اندر بہت کچھ رکھتی ہے۔ سب سے پہلے ہم بات کریں گے کہ یہ سورۃ کب، کہاں نازل ہوئی اور اس کا شانِ نزول کیا ہے۔

نبیؐ کی مکی زندگی کا آخری دور تھا۔ مکی دور میں آپؐ کے دو بڑے سہارے تھے، گھر کے اندر بیوی خدیجہؓ اور گھر کے باہر کے ماحول میں ابو طالب جو آپؐ کے لیے ایک ڈھال بنے ہوئے تھے۔ 10 نبوی کو عام الحُزن ہوا۔ یہ دونوں سہارے ٹوٹ گئے۔

دراصل اللہ تعالیٰ بتا رہے ہیں کہ ہر انسان کو زندگی میں چاہے ایک بار ہی سہی، تنہا ہونا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کی زندگی میں ایک موقع ایسا ضرور لاتا ہے، چاہے ایک دن کے لیے، سال کے لیے یا چند دنوں کے لیے ہو، کسی کا آزمائش کی صورت میں، کسی کا بیماری کی صورت میں، کسی کا بچے کے غم کی صورت میں آتا ہے، جب لوگوں سے لگی اُمیدیں کٹ جاتی ہیں۔ اُس وقت پھر اُسکو اللہ یاد آتا ہے۔ اس پوری سورۃ میں ہمیں حضرت یوسفؑ کے ساتھ ساتھ حضرت یعقوبؑ کے دو مواقع ایسے ملیں

گے کہ جس وقت اللہ نے اُنکو اولاد کی آزمائش میں ڈالا، اُس وقت اُنکا کیا ردِّ عمل تھا اور ایسے وقتوں میں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ سب ہمیں سورۃ یوسف میں ملتا ہے۔

مکی دور میں یہ سورۃ نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کو قریشِ مکہ کی وہ تمام دشمنیوں کی لیے ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا جس کی کوششیں وہ پچھلے دس بارہ سال سے کر رہے تھے۔ ہم پوری صورت میں نبیؐ اور حضرت یوسفؑ کا تقابل کرتے رہیں گے۔ ایک تقابل شروع میں کر لیتے ہیں اور وہ ہے اس سورۃ کا انداز۔

سورۃ یوسف میں حضرت یوسفؑ کی مکمل کہانی ہے۔ پورے قرآن میں یہ کہیں اور نہیں ہے۔ یہی انداز ہمیں سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کی کہانی پہ ملتا ہے۔ گو کہ حضرت موسیٰؑ کا قصہ پورے قرآن میں کئی بار ہے۔ یہ سورۃ یہود کے سوالات پہ اُتری تھی۔ حضرت یوسفؑ کے نام سے مکہ والے بالکل ناواقف تھے۔ مکہ والوں کے لیے حضرت یوسفؑ بہت مشہور و معروف ہستی نہیں تھے۔ جب بھی مکہ والے کہا جائے تو آپ سمجھ لیں "بنی اسماعیل"۔ یہود مدینہ میں رہتے تھے جو بنی اسرائیل سے تھے۔ یہ گاہے بگاہے نبیؐ کے مشن کو ناکام کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اُنہیں یہ پتہ تھا نبیؐ کا پیغام سچا ہے۔ آپؐ خود بھی سچے ہیں۔ آپؐ کا اخلاق بہت اچھا ہے۔ لھٰذا لوگ آپؐ کی طرف آئیں گے۔ لوگوں کے اندر جو حسد کے جذبے تھے اُنکو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے اکثر مکہ والوں کو اکساتے تھے کہ نبیؐ سے ایسے ایسے سوال کرو کہ جس کا آپؐ جواب نہ دے پائیں اور آپؐ کا جھوٹا ہونا (نعوذُباللہ) ثابت ہو جائے۔

اسی طرح کا ایک سوال مکہ والوں نے آپؐ سے کیا۔

اور وہ سوال یہ تھا کہ "جاؤ اُن ﷺ سے پوچھو کہ بنی اسرائیل مصر میں کب اور کیوں آئے تھے۔ انکا اپنا ملک تو کنعان تھا۔ یہود کے اُکسانے پہ مکہ والوں نے ایک سوال اُٹھایا تو اُس کے جواب میں یہ پوری سورۃ ایک ہی وقت میں نازل ہوئی۔ پوری سورۃ سوائے چار آیتوں کے مکی سورۃ ہے۔ یعنی صرف چار آیتیں مدنی ہیں باقی ساری سورۃ مکی ہے۔ بالکل ایسی ہی بات ہم سورۃ طٰہٰ میں بھی سُنیں گے۔ وہاں یہود نے ایک سوال اُٹھایا تھا کہ یہ بتایئے کہ بنی اسرائیل مصر سے کیسے چلے گئے تھے تو وہاں موسیٰؑ کی مصر سے مدین ہجرت کا قصہ آئے گا۔

سورۃ یوسف کا نام ایک نبی کے نام پہ ہے۔ اس سے پہلے ہم نے سورۃ یونس کے شروع میں بھی بات کی تھی کہ سورۃ یونس چونکہ سورۃ توبہ کے بعد آئی تھی تو بہت سے لوگ یہ سوچتے تھے کہ یہ حضرت یونس پہ ایک مضمون ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ آخری آیتوں میں ڈیڑھ دو لائنوں میں اُنکا ذکر ہوا۔ اس کے برعکس سورۃ یوسف کا مضمون ہی حضرت یوسفؑ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ لفظ یوسف کا کیا معنی ہے؟ تو یوسف کا معنی ہے "افسردہ"، دُکھی۔ لوگ حضرت یوسفؑ کے نام کے ساتھ ایک ہیرو کو سوچ لیتے ہیں۔ ایک خوبصورت، حسین لڑکا، لیکن یوسفؑ کی ساری زندگی دُکھوں میں کٹی۔ ابھی بچے تھے تو ماں کا انتقال ہو گیا۔ ایک بھائی تھا جسکا نام بنیامین تھا۔ پھر ان کی خالہ سے حضرت یعقوب نے شادی کی۔ حضرت یوسف اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی پچھلی تین نسلوں میں نبوت تھی۔ انکے تذکرے میں اللہ کے نبی نے فرمایا "کریم ابنُ کریم ابنُ کریم ابنُ الکریم"۔ یوسفؑ حضرت یعقوب کے بیٹے وہ بھی نبی، یعقوبؑ حضرت اسحاق کے بیٹے، وہ بھی

نبی، حضرت اسحاقؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے، وہ بھی نبی تو چار نسلوں تک نبیوں کا سلسلہ۔ یہ اعزاز حضرت یوسفؑ کے علاوہ کسی کو نہیں حاصل ہوا۔ نبوت کے ناتے سے یہ چوتھی نسل تھی۔

حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے یہ دو سگے بھائی تھے اور دس بیٹے دوسری ماں سے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ باپ ایک تھا لیکن ماں فرق تھی۔ اس سورۃ میں نبیؐ کے سفر ہجرت جس کی تیاریاں ہو رہی تھی اُسکا ذکر ہے۔ سورۃ یوسف میں نبیؐ کو جو سفر ہجرت کی تیاریاں کر رہے تھے، اُنکو ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا تھا۔ آپؐ کی تنہائیوں کو بانٹا جا رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے بعد نبیؐ تنہا ہو گئے۔ باہر آپؐ کے قتل کی تیاریاں تھیں۔ نبیؐ کو بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح حضرت یوسفؑ اپنے باپ کی محبت بھری گود سے نکال کے کنوئیں میں پہنچا دیئے گئے تو آپؐ کے ساتھ بھی یہی ہو گا۔ اب نبیؐ کے لیے یہ بہت بڑا امتحان تھا۔ نہ کبھی دیکھا نہ سُنا۔ یہود کا خیال تھا کہ آپؐ اس سوال کا جواب نہ دے کر شرمندہ ہوں گے، اور ہمیں ان کی جگہ بڑا بننے کا موقع مل جائے گا۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ انکو کچھ نہیں آتا۔ لیکن جواب کیا ہوا کہ ایک ہی نشست میں ساری کہانی آپؐ کی زبان پہ آ گئی۔ اور حوالِ یوسف کے نام سے قریشِ مکہ رسوا ہو گئے۔ ایک تو جواب مل گیا اُس پہ شرمندہ تھے دوسرا کہانی مکمل طور پر اُن پر فِٹ ہوتی تھی۔ یہ قصہ صرف اسی جگہ پر ہے اور دوسرا پوری سورۃ میں یہ قصہ ہے۔

آخری رکوع میں ہم پڑھیں گے کہ کتنے خوبصورت طریقے سے اللہ کے نبیؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی دعوت دی گئی۔ اس سے ایک بات پتہ چلتی ہے کہ اگر دین کے کاموں میں آپ تنہا رہ جائیں تو اللہ آسمانوں سے برکتیں نازل کرتا ہے۔

اس کو سورۃ حٰم سجدہ میں کہا گیا۔ جب مومن اللہ کے راستے پر چل پڑتے ہیں تو پھر اللہ کے سہارے پر ہی ڈٹ جاتے ہیں۔ اور پھر چاہے اُنکے اپنے بھی چھوڑ جائیں تو اللہ آسمانوں سے فرشتوں کو نازل کرتا ہے۔ ایک اور بات پتہ چلتی ہے کہ رات جتنی گہری ہو صُبح اُتنی قریب ہوتی ہے۔ تو بتایا جارہا ہے کہ اگر آپکو آج دین کے راستے میں مشکلیں آرہی ہیں تو کیا ہوا، نبیوں کو ستایا گیا۔ اے محمد ﷺ اگر آج آپ ستائے جارہے ہیں تو کل یوسفؑ بھی ستائے گئے تھے۔ آپؐ یہ دیکھیں کہ انجام کیا ہوا۔ یہ سورۃ اُمید کی ایک کرن ہے۔ اس سورۃ میں ہم بہت اُتار چڑھاو دیکھیں گے۔

اس سورۃ کی شانِ نزول میں ایک اور واقعہ آتا ہے کہ جب صحابہ اکرام نے آپکو بہت مشکلوں میں دیکھا تو بہت دُکھی ہوئے تو نبی کریمؐ کے پاس آئے اور کہا کہ اللہ کے نبی آج دل بہت گرفتہ ہے۔ پچھلے نبیوں کی کہانیوں میں سے کوئی کہانی سُنائیں تاکہ ہمارے قدم جمیں۔ ہم اسے موقعوں پہ اُس کے پاس جاتے ہیں جو قدم جمانے کی بجائے پہلے ہی پھسلا ہوتا ہے۔ تو صحابہ کرامؓ کو ڈر تھا کہ مشکلوں کہ وجہ سے کہیں ہمارے قدم اُکھڑنے نہ لگیں تو کہا کوئی ایسی کہانی سُنائیں کہ ہمارے قدم جم جائیں۔

تو اس پہ نبیؐ نے یہ کہانی سُنائی۔ پہلے ہم نے جتنے بھی نبیوں کی کہانیاں پڑہیں وہ انباء الرُسُل تھیں۔ انباء الرُسُل میں نبیوں کے مشن اور قوموں پہ عذاب کی بات ہوتی ہے۔ یہاں سورۃ یوسف انباء الرُسُل نہیں ہے۔ یہ قصص الانبیاء ہے۔ جوان ہوتے بچوں کو سُنانے والی کہانی ہے۔ ایسے ماحول میں پروان چڑھتے بچے جہاں لڑکیاں تو لڑکیاں، لڑکے بھی اپنی عزت نہ بچا سکیں، اُنکو یہ سورۃ زبانی حفظ کروانے کی ضرورت ہے۔ دعا کیجیئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمارے لیے عمل لینا آسان بنادے۔ آمین

پچھلی سورتوں کو پڑھتے ہوئے جب ہم نے نبیوں کا قصہ پڑھا تو وہ کہاں سے شروع ہوتا تھا کہ ہم نے نبی کو فلاں قوم کی طرف بھیجا اور اُس نے کیا کہا کہ اللہ کی عبادت کرو، تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ اس پوری سورۃ کے گزرنے کے آخر میں حضرت یوسفؑ کی زبان سے اس سے ملتے جُلتے الفاظ ملیں گے اور جب جیل کے قیدیوں کو دعوت دیں گے تو توحید کی دعوت دیں گے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ سورۃ یوسف حضرت یوسفؑ کے نبی بننے سے پہلے کے حالات بتاتی ہے۔

الٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۚ ﴿۱﴾

ا،ل،ر یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے ۔

ا،ل،ر حروفِ مقطعات ہیں۔ یہاں سے آگے چند سورتیں حروفِ مقطعات سے شروع ہوں گی۔ ان حروف سے جو سورتیں شروع ہوتی ہیں تو ان کے ساتھ ہی اگلی بات شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے سورۃ بقرہ کیسے شروع ہوئی، ا،ل،م، پھر آیت ختم۔ دوسری آیت تھی ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ۔ یہاں دیکھیے ا،ل،ر ایک ہی آیت ہے۔ یہاں تھوڑا سا رُکیں گے پھر تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ۔ یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں۔ کون سی کتاب؟ جو میں اور آپ پڑھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یقین دلا رہے ہیں کہ یہ کوئی عام کتاب نہیں ہیں۔ حروفِ مقطعات پہ ہم بات نہیں کریں گے کیوں کہ اللہ نے اس کے معنی نبی کو بھی نہیں بتائے۔ میں نے کسی کی زبان سے اپنے سُنا کہ یہ اللہ اور اُس کے رسول کے درمیان راز ہے۔ حالانکہ اللہ کے نبی کی واضع حدیث ہے کہ الف کی دس نیکیاں، ل کی دس نیکیاں، م کی دس نیکیاں۔ تو اس سے زیادہ اللہ کے نبیؐ کو بھی نہیں پتا۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا راز ہے جو اللہ نے اپنے نبی کو بھی نہیں بتایا۔ پندرہ سے زیادہ اقوال ہیں ا،ل،ر یہ۔ اسے کیا ہے، ل سے کیا ہے، ر سے رسول بنا کے بعد

میں اللہ اور اُس کے رسول کا کوئی ایبریوئیشن کر کے کچھ بتا دیا حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ایک دلچسپ بات نوٹ کر لیں کہ حروفِ تہجی کُل اٹھائیس(28)ہیں اور حروفِ مقطعات جو قرآن میں مختلف مجموعوں کی صورت میں آئے ہیں وہ چودہ(14)ہیں۔کسی کا ایک جملہ کہ عربوں کو چیلنج کیا جارہا ہے کہ حروفِ تہجی کے آدھے لفظوں کو تو تم سمجھ نہیں پائے۔حروفِ مقطعات کو نہ سمجھنا،انسانوں کو بے بس کرنے کی بات تھی۔تِلْكَ،اسم اشارہ بعید،دور کی چیز کے لیے۔اصل میں جب قریب کی چیز کو دور کی چیز کے ساتھ اشارہ کریں کہ "یہ وہ کتاب ہے"تو مُراد اُسکی شان بُلند کرنا ہوتا ہے۔الکتاب سے مُراد قرآن ہے اور المُبین سے مُراد؛

1۔یہ خود بھی واضع ہے،یعنی یہ کتاب پڑھنی آسان ہے

2۔اس سے جو مسائل اخذ ہوتے ہیں وہ بھی بڑے آسان ہیں۔اس بات کا ردّ ہے جو لوگ کہتے ہیں قرآن سمجھ نہیں آتا،قرآن بڑا مشکل ہے۔تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ بہت آسان کتاب ہے۔اسکو ثابت کرنے کے لیے آیت 2 میں کہا؛

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾

ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تا کہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔

یہ تھیم پوائنٹ ہے۔اِنَّآ میں شدت ہے۔یہ جمع کا صیغہ ہے تو یہاں کیوں آ گیا؟ تو اِمام ابنِ تیمیہ نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ جہاں بھی لفظ اِنَّآ آتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے یہ کام فرشتوں کے ذریعے کیا ہے۔دوسرا یہ کہ یہ لفظ 'عزت' کے لیے ہے۔جیسے پہلے دور کے بادشاہ خود کو عزت کے لیے 'میں' کی

بجائے 'ہم' کہتے تھے۔اس کی شدّت کو محسوس کیجیئے کہ ہم نے اسکو نازل کیا۔ یہاں ہٗ سے کیا مُراد ہے۔ ''قرآن''۔قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا کیا ہے؟ یہ قرآن کا سب سے معروف نام ہے۔ ہم قرآنِ پاک میں قرآن کے سارے نام پڑھیں گے۔ تو یہاں سب سے معروف نام ''قرآنِ عربیہ'' ہے۔

یہاں سے ایک بہت خوبصورت نقطہ نوٹ کیجیئے کہ اصل قرآن عربی ہی میں ہے۔ یہ جو ہم مختلف زبانوں میں ترجمہ کرتے ہیں یہ ترجمے نہیں ہوتے۔ قرآن کا ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔ کیسے؟ پہلے یہ سمجھیں کہ قرآن ہے کیا؟ قرآنِ پاک اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کا کلام کس زبان میں ہے، یہ میں اور آپ تو نہیں جانتے۔ ہم تیسویں پارے میں پڑھیں گے کہ ''بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے''۔ اسی بات پہ امام احمد بن حمبل کو کتنے کوڑے پڑتے تھے۔ بادشاہ کہتا تھا کہ کہو یہ مخلوق ہے لیکن امام احمد کہتے تھے نہیں یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو اللہ نے یہ کلام بول کے دیا۔ اس کا سب سے پہلے نزول کیسے ہوا۔

''اللہ نے بول کر لوحِ محفوظ میں جمع کروایا''۔ یہ بالکل ایسے ہے کہ میں بول رہی ہوں اور ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ بعد میں یہ ریکارڈنگ تمام ایڈمنز تک پہنچ جائے گی۔ لیکن جب کبھی کہیں گڑبڑ ہوتی ہے تو ساتھی کہتے ہیں ہمیں original copy بھیجیں۔ اب میں بول رہی ہوں تو میری ایک زبان ہے یعنی میں اُردو میں بول رہی ہوں۔ اللہ نے یہ کلام کس زبان میں بول کے دیا یہ ہم نہیں جانتے۔ لیکن دنیا میں بھیجنے کے لیے اسے عربی کے کنٹینر میں ڈال دیا۔ عربی زبان اللہ کی نہیں ہے۔ چونکہ عربوں میں نازل ہو رہی تھی، دوسری بات عربی زبان کی وسعتیں، عربی ایک سائنٹفک زُبان ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کے روٹ ہیں۔ دنیا کہ کسی اور زبان میں ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک لفظ لے لیں، ع، ب، د، اسی سے عابدہ، اسی سے معبود، اسی سے معبد، اسی سے عبادت، اسی سے عبودیت، ایک ہی خاندان کے نام

ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے لیے عربی زُبان کو چُنا۔ اصل چیز یہ ہے کہ اس کورس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کو عربی میں سمجھنے کے قابل ہونا۔ اسی لیے آپ کو لفظی ترجمہ کروایا جاتا ہے، ٹیسٹ لیے جاتے ہیں تا کہ آپ لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ بنیں۔

جب تک کوئی انسان قرآن کو عربی میں پڑھ کر عربی میں ہی نہ سمجھے آپ اُسکو عالم، مفتی، سکالر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ اِدھر اُدھر سے کچھ باتیں سیکھ لینا۔ شاہ فیصل کے بارے میں بڑا مشہور واقعہ آتا ہے کہ یہ بیمار ہو گئے اور علاج کے سلسلے میں یورپ آئے۔ مورس بکائی اُس وقت اُن کے سرجن تھے۔ شاہ فیصل نے اُنکو تبلیغ شروع کی۔ مورس بکائی نے پہلے سے کچھ اسلام کے بارے میں سُن رکھا تھا تو اُنہوں نے کہا کہ میں نے تو یہ یہ سُنا ہے۔ شاہ فیصل نے پوچھا کہ آپ نے قرآن سے پڑھا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہاں قرآن سے پڑھا ہے۔ تو کہا کہ دکھائیں۔ جب لائے تو وہ اِنگلش ترجمہ تھا۔ شاہ فیصل نے اُن کہ غلط فہمی تو دور کر دی لیکن مورس بکائی نے سوچا کہ ترجمے میں اتنا فرق ہو سکتا ہے۔ اُنہوں نے قرآن کو عربی میں سیکھنا شروع کیا اور بلآخر مسلمان ہو گئے۔ عربی زبان اتنی گہری ہے کہ علامہ اقبال نے جو بات اللہ تعالیٰ کے لیے کہی کہ؛

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

تو یہی حال قرآن میں ڈوبنے سے ہوتا ہے۔ اس کتاب اور اس زبان میں بہت حُسن ہے۔ میں کبھی سوچتی تھی کہ اگر میں عربی گھرانے میں پیدا ہوتی تو قرآن کو صحیح طرح سمجھ لیتی لیکن میری یہ خوش فہمی مصر جا کے ختم ہو گئی۔ بولنے والی عربی زبان قرآن کی عربی سے مختلف ہے۔ بہت سے عربی بھی قرآن کی تفسیر نہیں جانتے۔

تو انسان کی کامیابی کا نقطہ آغاز یہی ہے کہ قرآن کو اُس کی اصل زبان میں سمجھنے کی کوشش کرے۔

ترجمہ سے بھی کسی حد تک سمجھ آجاتی ہے لیکن اصل مزہ عربی میں سمجھنے سے آتا ہے۔ اپنے لفظی ترجمہ پہ کمر باندھ لیں۔ میں اسے ایک اینکر سمجھتی ہوں۔ کہ جب جہاز ڈوبنے لگتا ہے تو اُسکو اینکر سے باندھ دیتے ہیں۔ لفظی ترجمہ سیکھنے کا فائدہ آپکو رمضان میں سمجھ آتا ہے جب تراویح میں قرآن سمجھ آنے لگتا ہے تو آپ سوچتے ہیں کہ پہلے تو مجھے کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ جس طرح نماز عربی میں قبول ہے اسی طرح قرآن بھی عربی میں قبول ہے۔ ترجمانی بھی ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور تک تو ترجمے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن بعد میں صحابہ کے دور میں جب اس کی ضرورت پڑی، کیونکہ اسلام قیصر و قصرہ، فارس، روم تک پھیل چُکا تھا اور وہاں لوگوں کو عربی نہیں آتی تھی۔ تو تب یہ ضرورت پڑی کہ اس کا ترجمہ کریں۔ اُس وقت کے صحابہ کتنی دیر تک میٹنگز کرتے رہے کہ کہیں یہ بدعت تو نہیں ہو جائے گی۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کہ اگر اس کا ترجمہ نہیں ہو گا تو لوگ کیسے سمجھیں گے۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ سادہ قرآن پڑھنے کا بھی اثر ہوتا ہے۔ ایک ہندو سسٹر اس قرآن کو سُن کے دوبارہ اس کلاس میں آنا چاہتی ہیں۔ کچھ مسائل کی وجہ سے نہیں آپائیں تو میں نے کہا گھر سے سُن لیں۔ یہ قرآن کا اثر ہے۔ یہ قرآن کیوں بہترین نہ ہو کہ یہ بہترین شہر، بہترین انسان پہ بہترین فرشتے کے ذریعے اُترا۔ اور بہترین دور کے بہترین لوگوں کے ذریعے نسل در نسل چلا۔ ایک اور سوال آتا ہے کہ قرآن عربوں پہ ہی کیوں اُترا؟ تو عرب اُس وقت ایک Isolated خطہ تھا۔

کسی کو بھی یہ نہیں پتہ تھا کہ ان کی زمینوں میں تیل ہے۔ یہ ایک پُرانا سا ایک گاؤں تھا۔ لیکن عربوں میں کچھ خوبیاں تھیں۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ عرب کبھی غلام نہیں بنے۔ اور دوسرا عربوں

نے کبھی دنیا میں بادشاہی نہیں کی تھی۔ اُس وقت کی بڑی بڑی طاقتوں نے انہیں کبھی کسی قابل نہیں سمجھا تھا۔ نتیجہ کیا ہوا کہ عربوں کے اندر کچھ ایسی خوبیاں پیدا ہو گئیں جو قرآن کو پکڑنے کے لیے ضروری تھیں۔ اور وہ کیا تھیں

1۔ کبھی غلام نہیں بنے۔ کچھ خرابیاں غلامی کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور کچھ شاہی کے ساتھ۔ غلامی کے ساتھ کیا پیدا ہوتی ہے، "مرعوبیت"۔ سُپر پاورز کا رعب، انگلش کلچر کا رعب، یونیورسٹیز کا رعب۔ عرب اپنے کلچر میں سادہ لوگ تھے۔ دوسرا غلامی میں لوگوں کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑ جاتی ہے، عرب چونکہ کبھی غلام نہیں بنے تو انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تیسری چیز جو غلامی میں آتی ہے وہ چاپلوسی ہوتی ہے۔ اپنے مفادات کے لیے بادشاہوں کے آگے جُھکتے ہیں۔ انہوں نے یہ کبھی نہیں کیا۔ اسی طرح کی وہ تمام چیزیں جو غلاموں میں ہوتی ہیں وہ ان میں نہیں تھیں۔

اسی طرح جب کوئی قوم بادشاہ بنتی ہے تو اُن میں سب سے پہلے "تصنع" آجاتا ہے۔ پھر ریاکاری، دکھاوا، نقلی طریقے، تکبر، انا، یہ سب آتا ہے۔ عربوں میں یہ سب چیزیں نہیں تھیں۔

آج ہم انڈو پاک کے لوگوں کا جو حال ہے اور جو کچھ ہم پیش کر رہے ہیں یہ غلامی کی پیداوار ہے۔۔ ہم انگریزوں سے آزاد ہو کے بھی غلامی کے اثرات سے نہیں نکلے۔ حالانکہ ہمیں آزاد ہوئے بھی 60 سال سے اوپر ہو گئے۔ آج ہمارے اندر دکھاوا، رسم و رواج، انا، بچہ پیدا ہوا تو میکے سے یہ آئے گا، دُلہن کو پہلے پھیرے میں یہ دیں گے، یہ سب غلام قوموں کا مزاج ہوتا ہے۔ عرب ایسے تھے جیسے نیا پیدا ہونے والا بچہ۔ فطرت پر تھے۔ اللہ نے ان کو اس لیے چُنا کہ قرآن کو جذب کرنے کے لیے فطرت میں پلا بچہ سب سے بہترین ہے۔ علامہ اقبال کا ایک شعر بھی ہے کہ؛

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی۔۔یا بندہ صحرائی یا مردِ کُہستانی

یعنی کہتے ہیں کہ اللہ کے راز کو یا تو پہاڑوں پہ رہنے والا یا پھر کھیتوں میں کام کرنے والا ہی سمجھ سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ ہم جتنا آرٹیفیشل زندگی میں آجاتے ہیں اُتنا ہی ہماری نظر چیزوں کو بنانے والوں کی طرف جاتی ہو اور یہی اگر ہم کسی کھلی فضا میں جاتے ہیں تو ہماری نظر آسمان پہ اُٹھتی ہے، یا پھر ہری بھری گھاس پہ۔ عرب بالکل فطرت پہ تھے۔ ایسے ہی جتنا انسان سادہ مزاج ہوتا ہے یہ قرآن اُسکو اُتنا ہی زیادہ سمجھ آتا ہے۔ جس انسان میں تصنع، اکڑ، لوگوں کا رعب نہیں اُتنا اُسے قرآن سمجھ آتا ہے۔ اللہ نے اُتارا تو اُنہوں نے ایسے لیا جیسے دیا سلائی آگ کو لیتی ہے۔ مخالفت بھی بہت ہوئی لیکن پہلے دن حضرت خدیجہؓ آپؐ کی دعوت پہ مسلمان کیوں ہوئیں۔ دوسرے دن حضرت ابو بکرؓ تک بات پہنچی تو وہ کیوں مسلمان ہو گئے، کیوں کہ یہ لوگ فطرت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ جو مخالفت ہوئی تو وہ آرٹیفیشل زندگی کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگ تھے۔ آج ہم علامہ اقبال کے شعر پڑھتے ہیں۔ تو شکر ہے کہ علامہ اقبال اٹھارویں صدی کے شاعر تھے۔ اگر آج کے دَور میں وہ ہوتے تو کوئی اُن کو سُننے بھی نا جاتا۔ جیسے آج لوگ دینداروں کو سُننا پسند نہیں کرتے۔ اِلّاماشاءاللہ۔ کیوں کہ آج کمپیوٹر، ٹی وی نے لوگوں کو اتنا مصروف کر دیا، دنیاوی ترقی نے شاعری کا رُخ پھیر دیا تو جتنا انسان دنیاوی ترقی کرتا ہے اُتنا ہی اَدب سے دور ہو جاتا ہے۔ انسانی جذبات سے دور ہو جاتا ہے۔

تو اللہ نے ایک ایسی قوم کو چُنا جن پر اُس دور کی کسی چیز کا کوئی رعب نہیں تھا۔ ورنہ اس قرآن کا کیا حال ہو چُکا ہوتا۔ ان ساری باتوں کو سمجھا کے اللہ تعالیٰ نے اصل میں ایک کردار ہمارے سامنے رکھ دیا کہ تم لوگ آج بھی اگر اس قرآن کو سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے اندر ڈوب کے دیکھو۔ اب اس کے بعد

قصہ شروع ہونے لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قصے کی تمہید بنادی کہ عربوں کو یہ قصہ کیوں سُنایا جارہا ہے کہ اللہ کے کلام کو سمجھو اور اس میں سے تم اپنے لیے نصیحت کی غذا لو۔